وجودِ باری تعالیٰ پر ایک فیصلہ کُن شہادت

انڈریو کانوے ادمی۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ایم۔ ڈی۔ ڈی۔ ایس۔ سی۔ ایل۔ ایل۔ ڈی (ترجمہ: عبدالحمید صدیقی)

[یہ مضمون پھیلتی ہوئی کائنات میں وجودِ باری تعالیٰ کے آخری باب کا ترجمہ ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ مکمل ہو چکا ہے اور مکتبہ افکارِ اسلامی لاہور اسے عنقریب شائع کر رہا ہے]

کیا خدا ہے ؟ یقیناً ہے! مجھے اس کے وجود کے بارے میں اتنا ہی محکم یقین ہے جتنا کہ اس کائنات کی دوسری حقیقتوں کا ہے۔ میں جس قدر وثوق سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں ہوں اور دنیا میں موجود ہوں اس سے کہیں زیادہ وثوق کے ساتھ میں خدا کے وجود کا دعویٰ کر سکتا ہوں۔

ایمان باللہ ہی سے اس کائنات کے وجود کی صحیح تعبیر و توجیہ کی جا سکتی ہے، اسی کے ذریعہ انسانی ذہن میں یہ خیال راسخ ہوتا ہے کہ انسان اپنی ایک مستقل شخصیت رکھتا ہے اور محض مادہ اور قوت کا پیکر نہیں یہی وہ عقیدہ ہے جو انسان کے اندر اس احساس کی آبیاری کرتا ہے کہ نوع بشری کے سارے ارکان فطرت کے اعتبار سے برابر اور ایک دوسرے کے ساتھ رشتۂ اخوت میں مربوط ہیں۔ پھر اُس بلند و بالا ذات پر ایمان ہی ہمیں اپنے حقوق سے آشنا اور اپنے فرائض سے آگاہ کرتا ہے۔ ان حقوق اور فرائض کی تہ میں یہ بنیادی تصور کارفرما ہے کہ ہم ایک ذات کی نگاہ میں جس کی محبت پاک،

۴۔ اسلامی تحریک میں شامل ہوئے اور اسی خوشی میں انہوں نے ۴ ہزار غلام آزاد کیے۔

گویا حکومت کے سول محکمے اس سرگرمی اور یک جہتی سے متواتر کام کر رہے تھے اور اسی وسیع پیمانے کی تعلیمی مہم کا نتیجہ تھا کہ عرب کی بعید ترین آبادیوں میں صرف سیاسی نہیں، ذہنی اور قلبی انقلاب رونما ہوتا چلا گیا۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ اخلاقی لحاظ سے کایا پلٹ گئی۔ بالآخر عرب کا اجتماعی انسان بدل کر بالکل نئے روپ میں اُبھرا۔

اور جس کا انصاف بے لاگ ہے، سب یکساں اور برابر ہیں۔ اس نظریۂ حیات کو اپنانے سے ہمارے اندر اس بات کا شعور بیدار ہوتا ہے کہ ذلت و ناکامی، یا فلاح و کامرانی کا واحد سرچشمہ اللہ تعالیٰ ہے اور اس کی مشیت کے بغیر ایک پتہ بھی نہیں ہل سکتا اس لیے قدرتی طور پر یہ عقیدہ انسان کو قوت و طاقت کے ایسے لازوال خزانے عطا کرتا ہے جن کی کوئی نظیر نہیں پیش کی جا سکتی۔ یہ عقیدہ ہی وہ محکم اور ٹھوس بنیاد ہے جس پر مستقل اور پائیدار اقدار کا ایک وسیع الشان محل تعمیر ہوتا ہے کیونکہ ازل و ابد کا تصور اسی ذات سے وابستہ ہے۔

تصورات کے وہ اصول جو ہمیں روزمرہ کے تجربات سے حاصل ہوتے ہیں وہ اس قابل ہیں کہ ان کے ذریعہ خدا کے وجود کو منطقی طور پر ثابت کیا جا سکے۔ اسی قسم کا ایک اصول تھامس اکوئنس نے پیش کیا تھا۔ اس طرز استدلال کے اساسی اصول ان تجربات سے ماخوذ ہیں جن سے بہت سے والدین کو ایک بچے کی ذہنی نشو و نما کرتے ہوئے سابقہ پیش آتا ہے۔ خدا کے وجود کو منطقی طور پر اس محکم طریق سے ثابت کیا جا چکا ہے کہ اس سے ان لاتعداد مفکرین کو دولتِ ایمانی اور طمانیت قلبی حاصل ہوئی ہے جن کا سائنس کی ترقی اور انسانی فوز و فلاح میں ایک بہت بڑا حصہ ہے۔

یہ قول کہ خدا موجود ہے اس کو جھٹلایا نہیں جا سکتا اور یہ دعویٰ کہ خدا نہیں ہے اس کو ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ کارل مارکس اور لینن کی طرح بہت سے ملحدین نے باری تعالیٰ کے وجود کی نفی تو کی ہے لیکن اس کے انکار کے لیے وہ آج تک کوئی عقلی ثبوت فراہم نہیں کر سکے۔ ایک آدمی کو اس بات کا پورا پورا اختیار حاصل ہے کہ وہ کسی چیز کے متعلق شک و شبہ کا اظہار کرے لیکن اس کے ساتھ اس کا یہ فرض بھی ہے کہ وہ اپنے اس اشتباہ کے لیے کوئی ٹھوس عقلی دلائل بھی پیش کر سکے۔ میری نظر سے آج تک نہ تو کوئی ایسی تحریر گزری ہے اور نہ ہی میں نے کبھی کوئی ایسی تقریر سنی ہے جس میں علمی استدلال کے ساتھ اس بات کو ثابت کیا گیا ہو کہ خدا کا وجود محض افسانہ ہے۔ اس کے برعکس بہت سی ایسی کتابیں میرے زیر مطالعہ آئی ہیں جن سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ خدا موجود ہے۔ پھر میں نے ان خوشگوار اثرات کا بھی جائزہ لیا ہے جو ایمان باللہ لوگوں کے قلب و دماغ پر مرتب کرتا ہے اور ان مضر نتائج سے بھی

واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی ہے جو انکارِ خدا سے پیدا ہوتے ہیں۔

ملحدین باری تعالیٰ کے وجود کے لیے بالعموم جو ثبوت طلب کرتے ہیں اُن کی نوعیت دیکھ کر اس بات کا بآسانی اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ حضرات خدا کو ایک انسان، ایک مجسمہ، بُت یا مورتی سمجھ بیٹھے ہیں۔ اگر خدا ان مختلف پیکروں میں جلوہ گر ہوتا یا وہ حسی صفات سے متصف ہوتا تو پھر اس کے وجود کے بارے میں دو رائیں ممکن نہ تھیں۔ خداوند تعالیٰ نے اس کائنات میں انسان کو جو مقام عطا کیا ہے اُس میں چونکہ اُسے اختیار کی نعمت سے بھی مالا مال کیا گیا ہے اور اسے اس بات کی آزادی بخشی گئی ہے کہ اگر چاہے تو خالق کے وجود کا اقرار کرے اور اگر چاہے تو انکار کر دے، اس لیے اس فیصلہ میں بھی وہ جو روش اختیار کرتا ہے وہ بھی خدائی منصوبہ بندی کے ذیل میں آجاتی ہے۔ وہ اس معاملہ میں خود مختار ہے کہ کمزور اور بودی دلیلوں کا سہارا لے کر ذاتِ باری تعالیٰ کے بارے میں ریب و تشکک میں مبتلا ہو اور پھر اُن بُرے نتائج کو بھگتنے کے لیے تیار ہو جو اس ملحدانہ اندازِ فکر کے بالکل قدرتی اور منطقی تقاضے ہیں۔

بہت سے دہریے اور کچھ عیسائی بھی خدا کو ایک ایسی شخصیت خیال کرتے ہیں جس سے انسان سودا بازی کر سکتا ہے۔ وہ بسا اوقات یہ کہتے ہوئے سنے گئے ہیں "میں صرف اسی صورت میں نیکی اور تقویٰ کی راہ اختیار کروں گا اگر خدا میری روح کو نجات دلائے گا۔ میں خدا پر اُس وقت ایمان لاؤں گا اگر وہ ہمیں بارش سے نوازے گا یا سیلابوں کی روک تھام کرے گا۔ یا میرے کرب و اضطراب کو سکون و اطمینان سے بدل دیگا یا دنیا سے برائی اور ناانصافی، یا جور و جفا کا خاتمہ کرے گا۔ اگر رحیم و کریم خدا فی الواقع موجود ہوتا تو میرے مسوڑوں میں کیونکر ٹیس اٹھتی۔ اس قسم کے لغو طرزِ استدلال کا مطلب یہ ہوا کہ میں خدا پر صرف اسی صورت میں ایمان لا سکتا ہوں اگر وہ اس کائنات کو میرے پیش کردہ منصوبہ کے تحت پھر سے تعمیر کرنے پر رضامند ہو جائے اور اس نظام کی تخلیق میں میری عقل ایک فیصلہ کن قوت کی حیثیت سے شریک ہو۔

معرفتِ الٰہی کا سیدھا اور معقول راستہ یہ ہے کہ ہم اپنے دل و دماغ کو ہر قسم کی نفسانیت، اور کجی سے پاک کریں اور اپنے راستے سے اُن سارے موانع کو دُور کریں جو صحیح اندازِ فکر کی راہ میں بالعموم حائل ہوتے ہیں۔ یہی وہ طریقہ ہے جس کو اختیار کر کے ہمارا خدا پر ایمان اور یقین پختہ ہو جاتا ہے اور اس طرح ہم اس

ظلم و تعدّی کی اس دنیا سے بیخ کنی کر سکتے جس کا ہم ہر وقت رونا روتے رہتے ہیں۔ ایک شخص کو خوراک کے اثرات پر جس قدر گہرا یقین ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ محکم ایمان خدا کے پرستار اپنے خالق پر رکھتے ہیں۔ خدا ہم پر یہ فرض عائد کرتا ہے کہ ہم ہر وقت برائیوں کا تذکرہ کرنے کی بجائے اُن منکرات کے استیصال کی فکر کریں جو اس دنیا میں ہر سُو پھیلے ہوئے ہیں اور اپنی عقلی اور فکری صلاحیتیں اس جدوجہد کی نذر کر دیں جس سے خدا کی بادشاہت کا خواب، اس آب و گل کی دنیا میں شرمندۂ تعبیر ہو جائے۔

میرے اُس خالق پر ایمان کی بنیاد جس نے کائنات کی ہر شے کو پیدا کیا ہے، جس کی قدرت ہر چیز پر حاوی ہے اور جو مجھ میں اور مجھ جیسے دوسرے انسانوں میں یکساں دلچسپی رکھتا ہے، اعتقاد، امید اور محبت ہے۔ ایمان کی اساس اگر رجائیت اور محبت نہ ہو اور اگر اس کی تائید عقل و خرد سے نہ ہوتی ہو تو ایسا ایمان میرے لیے کبھی بھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔

انسان کو اپنے ذہنی قویٰ کبھی بھی معطل نہیں کرنے چاہئیں بلکہ اس کا یہ فرض ہے کہ وہ اُن سے صحیح صحیح کام لے۔ وہ ایمان جس کو عقل سہارا نہ دے سکے وہ بہت کمزور ہوتا ہے اور کسی وقت بھی خارجی حملوں سے برباد ہو سکتا ہے۔ ایسے اندھے بہرے اعتقادات سے سیرت و کردار کے اندر بہت سے نقائص رہ جاتے ہیں۔ لہٰذا انسان کے لیے یہ چیز ازبس ضروری ہے کہ وہ عقل سے کبھی بھی دستبردار نہ ہو اور فکر و عمل کے اُن عام اصولوں سے صرفِ نظر نہ کرے جن سے وہ اپنی روزمرہ زندگی میں کام لیتا ہے یا جن سے بڑے بڑے سائنس دان اپنی تحقیقات و انکشافات میں مدد لیتے ہیں۔ جو اصول مادی ترقی میں ہماری رہنمائی کرتے ہیں وہی اصول خدا کے معاملے میں ہمیں ایک صحیح نتیجہ تک پہنچا سکتے ہیں ــــ

وہ اصول جن کے تحت ہم اس بات کو جانتے ہیں کہ کل صبح سورج طلوع ہو گا، یا کل میں ضروریاتِ زندگی کے حصول کے لیے جدوجہد کروں گا یا اپنے کاروبار میں گوناگوں مسرت محسوس کروں گا۔ اگر فکری صلاحیتیں مادی فلاح و بہبود کے لیے کامیابی کے ساتھ استعمال کی جا سکتی ہیں تو پھر میں یہ بات سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آخر انہیں روحانی اور اخلاقی ترقی کے لیے کیوں مشعلِ راہ نہیں بنایا جا سکتا۔ ہر فرد کو پوری جرأت و بیباکی سے اُس طرزِ استدلال کی نشاندہی کرنی چاہیے جس پر اُس کے دین و ایمان کا دارومدار ہے اور پھر اعمالِ صالح

کی گواہی سے اپنے اس ایمان کی صداقت کا ثبوت بہم پہنچانا چاہیے۔

اگر تم خدا کے وجود کو دلائل سے ثابت نہیں کر سکتے تو پھر تمہیں اس ذات کو محض ایک عقیدہ کی حیثیت سے ماننا ہوگا۔ اور یہ چیز بھی عقل و فکر کے منافی نہیں بلکہ اُس کے عین مطابق ہے۔ ہم زندگی کی بے شمار چیزوں کو بدیہی حقائق سمجھ کر، بغیر کسی دلیل کے قبول کر لیتے ہیں۔ ٹھامس جیفرسن نے اعلانِ آزادی میں بعض ایسے حقائق کی طرف ہی اشارہ کیا جب اُس نے کہا:

ہمارے نزدیک یہ چیزیں مسلمات کی حیثیت رکھتی ہیں کہ سارے انسان انسانیت کے اعتبار سے برابر ہیں اور انہیں اُن کے خالق اور مالک نے بعض مستقل حقوق عطا کیے ہیں۔ انسانوں میں زندگی کی حرارت، آزادی کی تڑپ اور مسرت کی خواہش ہر وقت موجود رہتی ہے۔ انہیں حقوق کی حفاظت اور پاسبانی کے لیے حکومتیں معرضِ وجود میں آتی ہیں"

جب ایک شخص یہ کہتا ہے کہ وہ خدا کو محض عقیدے کے طور پر مانتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ کوئی خلافِ عقل بات کر رہا ہے بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ وہ خدا کو ایک ایسی بدیہی حقیقت سمجھتا ہے جس کے لیے وہ کسی منطقی استدلال کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ یہ کہنا کہ خدا کا وجود ایک امرِ واقعہ ہے اُس کے عدمِ وجود کی دلیل نہیں ہو سکتا — بلکہ کھینچ تان کر بھی اگر اس کا کوئی مطلب نکالا جا سکتا ہے تو صرف یہ ہے کہ میں اس چیز کو سائنٹفک طور پر ثابت کرنے سے قاصر ہوں یا میں اپنے دعوے کے ثبوت میں کوئی منطقی دلیل پیش نہیں کر سکتا۔ خدا تو موجود ہے لیکن اُس کے وجود کو علمی طور پر منوانے کے لیے اگر میں کوئی دلائل نہیں رکھتا تو یہ میری اپنی کوتاہی ہے اور میری اس کم نظری کو کسی طرح بھی امرِ واقعہ کے غلط ہونے کے لیے دلیل نہیں بنایا جا سکتا۔ ممکن ہے اس معاملہ میں میرا علم ناقص ہو، یا میں اس کے لیے خاطر خواہ تیاری نہیں کر سکا یا میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس قسم کے طرزِ استدلال کے لیے یہ موقع موزوں نہیں ہو سکتا۔ میری آج تک کسی ایسے شخص سے ملاقات نہیں ہوئی جس سے جب اصرار کے ساتھ یہ پوچھا گیا کہ وہ خدا پر کیوں ایمان لایا ہے تو اُس نے اُس کے لیے کوئی دلیل نہ پیش کی ہو۔ اگر ان مختلف افراد کے مختلف دلائل کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ الفاظ کے اختلاف کے باوجود اُن کا مقصد اور مدعا ایک ہی ہوتا ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس

کائنات کا ایک خالق ضرور ہونا چاہیے اور اس کے نظام کو چلانے کے لیے ایک ناظم اور نگران کی بھی اشد ضرورت ہے۔ اگر ایک مشین مشین ساز کے بغیر معرضِ وجود میں نہیں آسکتی تو یہ کائنات ایک خالق کے بغیر کس طرح پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ ایک بنیادی حقیقت ہے جسے ہر بچہ، بوڑھا اور نوجوان نہ صرف اچھی طرح جانتا ہے بلکہ اسے پوری طرح مانتا بھی ہے۔

ایک بچے کا طرزِ استدلال جب میری عمر تقریباً تین برس کی تھی تو میں نے اس عمر کے عام بچوں کی طرح اپنے والدین سے اس قسم کے سوالات پوچھنے شروع کیے: مجھے ان پرندوں کو جنہیں میں دیکھ رہا ہوں، ہماری اس گائے کو اور اس کائنات کو کس نے پیدا کیا۔ زندگی کے سیدھے سادے حقائق اور میرے ذاتی تجربات نے میرے ذہن میں اس خیال کو راسخ کر دیا کہ مشین مشین ساز کے بغیر معرضِ وجود میں نہیں آسکتی۔ اس مقام پر میرے فکر نے میری دستگیری کی اور میں ان ابتدائی معلومات سے گزر کر کہ میں ہوں، پرندے موجود ہیں اور گائے ہے۔ اس نتیجہ پر پہنچا کہ ان سب چیزوں کے وجود کی کوئی نہ کوئی علت ضرور ہونی چاہیے اور وہ علت اولیٰ خالق اور مالک کی بلند و بالا ذات کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ اس طریق سے میرے فہم نے جو ہر قسم کی الجھنوں اور پریشانیوں سے پاک اور ذہنی مغالطوں سے ناآشنا تھا اُس نے زندگی کے اُن اسرار و رموز کا ادراک کیا جو بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔

فکر و عمل کے تعامل سے میرے اندر شعورِ ذات پیدا ہوا اور میں نے وجود اور عدمِ وجود کے درمیان تمیز کرنا سیکھا، یا دوسرے لفظوں میں میرے اندر یہ احساس بیدار ہوا کہ میں ہوں، اور پرندہ، گائے یا دنیا نہیں ہوں۔ اس طرح اوائل عمر ہی میں میرے ذہن نے "وجود اور عدم وجود" کے اصولوں سے مجھے آشنا کیا۔ اس کے علاوہ اسی دور میں مجھے جزو اور کل کے باہمی تعلق کا بھی علم ہوا اور مجھے یہ حقیقت معلوم ہو گئی کہ کل جزو سے ہمیشہ اور ہر حالت میں بڑا ہی ہوتا ہے۔

وجود اور عدمِ وجود کے احساس کے پرورش پانے کے ساتھ ساتھ بچے کے اندر استدلال کی یہ قوت اور صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اثبات و نفی کو ایک جگہ جمع نہیں کرتا۔ چھوٹے بچے

بھی اپنے اور اپنی بہن کے درمیان پوری طرح تمیز کر سکتے ہیں اور وہ یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں کہ "یہ میں ٹام ہوں اور وہ میری بہن میری ہے" اُن کے اندر بھی اتنی عقل ضرور موجود ہوتی ہے کہ سوائے مذاق کے یہ کبھی نہیں کہتے۔ کہ "ہم میری ہیں اور ہماری بہن ٹام ہے" پھر ایک بچہ اس حقیقت کو بھی اچھی طرح جانتا ہے کہ مربع کو گول کہنا غلط ہے۔ مربع اپنی اس شکل کے لیے کافی وجوہ رکھتا ہے اور یہی وجوہ اس کے مربع ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔

بچے کا یہ علم اور یہ حقیقت کہ بچہ اپنے اور پوری کائنات کے خالق کی معرفت حاصل کرنے کا انتہائی آرزو مند ہے، اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ اُس نے علت و معلول کے بنیادی اصول کو دریافت کر لیا ہے۔ وہ اس امر سے پوری طرح واقف ہو چکا ہے کہ ہر نتیجہ کا ایک سبب ضرور ہوتا ہے اور کوئی مشین بھی مشین ساز کی حکمت و دانائی کے بغیر تیار نہیں ہو سکتی۔ یہ اندازِ فکر زنجیر کے حلقوں کی طرح مسلسل چلتا ہے اور انسانی ذہن اپنے وجود اور کائنات کے وجود سے قدرتی طور پر اس ذات کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو اس ساری تخلیق کی علتِ اولیٰ ہے جب بھی انسان حرکت کے بارے میں سوچتا ہے تو اُس کے دماغ میں فوراً محرک کا تصور آ جاتا ہے اسی حقیقت کو ایک دوسرے طریق سے یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

کائنات پر ایک نگاہ دوڑائیے تو آپ کو اس میں ایک زبردست نظم و ترتیب نظر آئے گی۔ یہ نظم و ترتیب ایک ناظم اور مرتب کے وجود کی زندہ شہادت ہے۔ اتنی وسیع و عریض کائنات کا نظم و نسق کوئی معمولی شخصیت سنبھال نہیں سکتی۔ لہٰذا اس کائنات کی ناظم وہی قادرِ مطلق ذات ہے جس کی قوتوں کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ وہ اندازِ فکر ہے جس کو اختیار کر لینے کے بعد ایک تین چار سال کا بچہ بھی علت و معلول کے ذریعہ خداوند تعالیٰ کو پہچان سکتا ہے۔

میں نے ایک سائنس دان کی حیثیت سے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اُن اسباب کو معلوم کرنے پر صرف کیا ہے جو حدِ ادراک سے ماوراء حقائق کے پیچھے کار فرما ہیں۔ میرا ذہن کائنات کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ نظامِ تکوینی کے پرے اُس حقیقتِ کبریٰ کا کھوج لگانے کے لیے

بیتاب رہتا ہے جو ساری روحانی اقدار کا واحد سرچشمہ ہے۔ اپنی اس تحقیق کے دوران میں میں نے علومِ طبیعی اور علومِ اخلاقی کا اچھا خاصا مطالعہ کیا۔ میں اس چیز سے غافل نہیں ہوں کہ بہت سے نامور مصنفین جن میں مشہور و معروف فلسفی اور مفکرین بھی شامل ہیں، انہوں نے اس میدان میں بہت سی ٹھوکریں کھائی ہیں۔ اس سلسلہ میں یا تو انہوں نے معروف حقائق سے مجرمانہ تغافل برتا ہے یا محسوسات سے بلند ہو کر کبھی سوچنا اور غور کرنا گوارا نہیں کیا۔ وہ سائنس دان جو ہمیشہ محسوسات کے خم و پیچ ہی میں اُلجھتے رہتے ہیں وہ دراصل اپنی ترقی کی راہ میں خود ہی موانع پیدا کرتے ہیں۔ ایک صاحبِ فکر حقیقی کامیابی سے صرف اسی وقت ہمکنار ہوتا ہے جب وہ مادہ کی تنگ و تاریک دنیا سے نکل کر اس ادراک کو اپنا رہنما تسلیم کرنے پر آمادہ ہو جو اس کائنات میں ایک ہم آہنگی پاتا ہے اور پھر ایمان، محبت اور صداقت کی زادِ راہ لے کر آگے بڑھنے کی فکر کرے۔

قانونِ علت کافی سالوں کا ذکر ہے کہ بہت سے تاجر کھانے کی میز پر بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ اسی دوران میں ایک سائنس دان کا ذکر آگیا۔ اس پر ایک شخص نے کہا کہ وہ تو پکا ملحد ہے۔ ایک دوسرے تاجر نے اس فقرہ پر گرہ لگائی اور بڑے وثوق کے ساتھ یہ دعویٰ کر دیا کہ سائنس دانوں کی اکثریت خدا کی منکر ہوتی ہے۔ اپنی اس رائے کے اظہار کے بعد اُس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مجھ سے اشاروں اشاروں میں اس بات کا مطالبہ کیا کہ میں اس رائے کے بارے میں اپنے ذاتی احساسات پیش کروں۔ میں نے اس رائے کی پُرزور تردید کی اور کہا کہ یہ سائنس دانوں پر محض اتہام ہے۔ میں یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ سائنس کی دنیا میں جتنے نامور لوگ گزرے ہیں اور جنہوں نے انسانیت کو اپنی تحقیقات سے بہرہ مند کیا اُن کی ایک عظیم اکثریت خداوند تعالیٰ کے وجود کی قائل ہے۔ اُن میں بعض کے خیالات کو یا تو غلط رنگ میں پیش کیا گیا ہے یا لوگوں کو انہیں سمجھنے میں غلطی لگی ہے انکارِ خدا اُن کے اندازِ فکر کے ہی منافی ہے جس کے مطابق ایک سائنس دان سوچتا اور تحقیقات کے میدان میں

آگے بڑھتا ہے۔ وہ اپنے کام کا آغاز اس بنیادی تصور سے کرتا ہے کہ کوئی مشین بھی مشین ساز کی قوت فکر و عمل کے بغیر معرضِ وجود میں نہیں آسکتی۔ وہ معلوم و معروف حقائق سے استدلال کرتا ہے اور عزم و یقین کی دولت لیئے ہوئے تجربہ گاہ میں داخل ہوتا ہے۔ سائنس دانوں کی معتد بہ تعداد نئے نئے حقائق کی گرہ کشائی میں جن مصائب اور تکالیف سے دوچار ہوتی ہے اُن کے پیچھے عام طور پر علم کی محبت، نوع بشری کی محبت اور خالق کی محبت کا جذبہ ہی کارفرما ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں سائنس دان اپنی زیادہ تر توجہ آلات اور اجسام پر صرف کرتا ہے ایسی چیزیں جو مشاہدہ اور تجربہ کی گرفت میں آسکیں مگر اس کی تحقیق کی بنیاد ان چیزوں پر نہیں بلکہ علت و معلول کے اُس اصول پر ہے جو اس کائنات کے پورے نظام میں جاری و ساری ہے۔ وہ اپنی تحقیق کی پوری عمارت اس بنیادی تصور پر اٹھاتا ہے کہ اس کائنات میں ایک نظم و ترتیب ہے اور اس کے خارجی مظاہر میں حیرت انگیز اختلاف کے باوجود ایک معنوی ربط پایا جاتا ہے۔ علت و معلول کا اصول ہی دراصل اُس کی اساس ہے۔

علم الابدان میں جب ہم جسم کی بقا، اُس کی نشوونما اور اس کی تخریب و تعمیر کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہر خلیہ بلا استثناء اپنے اُس فرض کو بڑی خوبی کے ساتھ انجام دیتا ہے جو اسے جسم کی مجموعی فلاح کے سلسلے میں سونپا گیا ہے۔ نظامِ اعصاب میں وہ اعمال جو محض اضطراراً صادر ہوتے ہیں اُن کے پیچھے بھی ایک گہری حکمت اور مقصدیت کام کرتی ہے اور یہ مقصدیت اُن کا ایک بنیادی وقف ہے۔ جب انسان اسی نہج پر مزید غور و خوض کرتا چلا جائے تو وہ بالکل فطرتی طور پر اس نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے کہ ذہنی نشوونما کے لیے فطرت نے جو نظام قائم کیا ہے وہ حسی تجربات کے تعامل سے علت و معلول کے رشتہ کو قبول کرنے پر بالکل مجبور ہوتا ہے بالفاظِ دیگر اسی حقیقت کو یوں کہا جاسکتا ہے کہ وہ مشین جو سارے جسم کے مقصدی اعمال کی ذمہ دار ہے وہ ترقی کرتے کرتے یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ حسی تجربات کے ساتھ مل کر اس میں شعور و آگہی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ شعور پھر اُس کے اندر احساس قدر یا احساس علت پرورش کرتا ہے۔ یہ ہے

وہ طریق جس سے ایک خلیہ کا مقصدی ردعمل ارتقائی مراحل سے گزرتا ہوا اپنے اردگرد کی پھیلی ہوئی دنیا کا شعور اور احساس حاصل کرتا ہے۔ اس کے بعد اس میں احساس امتیاز جنم لیتا ہے جس کی مدد سے وہ اپنے اعمال کو علت و معلول کی کڑیوں میں جوڑتا ہے اور پھر وہ اپنے ماحول پر قدرت حاصل کرنے کی سعی کرتا ہے۔

علم الادیان کے مطالعہ سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ مچھلی کے گلپھڑے اس بات کی زندہ شہادت ہیں کہ اس جانور کے نزدیک پانی کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔ پرندے اور انسانی پھیپھڑے ہوا کے وجود پر دلالت کرتے ہیں۔ انسان کی آنکھیں روشنی کی اہمیت واضح کرتی ہیں۔ جو انسان بھی علم کے حصول کے لیے کمربستہ ہوتا ہے اس کی نگاہ میں حقائق کا وجود سب پر مقدم ہے۔ اس کرۂ ارضی پر زندگی کا موجود ہونا ہی اس بات کی علامت ہے کہ یہاں ایک قانون طبیعی کارفرما ہے جو زندگی کی بقا اور نشوونما کا ضامن ہے۔ اگر یہ سب چیزیں اپنی جگہ صحیح اور درست ہیں اور اس کائنات میں علت و معلول کا ایک زبردست رشتہ قائم ہے تو پھر فکری دلیل حیران ہے کہ فہم و فراست، صحیح طرز استدلال، ہمت و شجاعت، احساس فرض، ایمان اور یقین کیوں کسی بلند و بالا ذات کے وجود کی شہادت نہیں دیتے۔ میرے نزدیک اس سے بڑی حماقت اور کوئی نہیں کہ یہ فرض کر لیا جائے کہ عمیق اور گہرے خیالات، مقدس احساسات و جذبات اور نیک اور صالح افعال کسی برتر ذات کے وجود کے گواہ نہیں ہیں۔ یہ سب کیفیات، یہ سارے افکار اعمال اس سب سے ارفع و اعلیٰ ذات، اس خالق و مالک کے وجود کی گواہی دیتے ہیں جسے اس جہانگاہِ حیات میں ہر وہ شخص محسوس کر سکتا ہے جو اس کی معرفت حاصل کرنے کا آرزومند ہے اور جو اس راہ میں خود غیر فطری موانع پیدا نہیں کرتا۔ قانونِ علت کی نفی نہیں کی جا سکتی۔ ساری کائنات اسی کے دم قدم سے قائم ہے۔ انسانی ذہن بھی اسی کے سہارے اپنے مقدس فرائض انجام دیتا ہے۔ یہ قانون اس کائنات کی ایک نہایت ہی ٹھوس حقیقت ہے۔

میں نے بعض سائنس دانوں کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ علت و معلول کا سلسلہ وہاں ختم

ہو جاتا ہے جہاں ماورائے ادراک کی دنیا شروع ہوتی ہے یا غور و فکر کے متعارف اصولوں کو عملی زندگی پر منطبق کرنا مقصود ہوتا ہے۔ میں اس بات کو عقل و فکر کے منافی سمجھتا ہوں کہ کوئی انسان علت و معلول کے اصول کو اُس وقت تک کام میں لاتا رہے جب تک اُسے اپنے نظریہ کی تائید مقصود ہو اور جس مقام سے یہ اُس کے بنیادی تصور کا ساتھ دینا چھوڑ دے تو وہ بھی اسے خیرباد کہہ دے۔ علت و معلول کی لمبی زنجیر میں ایک مابعد الطبیعی حلقہ کا اضافہ کوئی غیر فطری بات نہیں ہے۔ ہم سائنس اور روزمرہ کے دوسرے مسائل میں اسی طریق سے کام لیتے ہیں۔ یہ ایک الگ بحث ہے کہ وہ حلقہ صحیح بھی ہو لیکن جو انسان اس کی صحت پر غور و فکر کرنے کے لیے تیار ہے اُس کے لیے پہلے اُس کے وجود کو تسلیم کرنا ضروری ہے۔

خدا سے باغی لوگوں کے افکار و نظریات کا سرسری جائزہ لینے سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے دماغوں میں کچھ ایسا فتور ہے کہ وہ اس سادہ سی حقیقت کو بھی سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اس کائنات کی علتِ غائی خدا کی معرفت کے بعد ہی سمجھ میں آتی ہے اور اگر اس ذات کا انکار کر دیا جائے تو یہ سارا نظامِ عالم ایک ناقابلِ فہم معمہ بن جاتا ہے۔ آئن سٹائن نے کس قدر درست کہا تھا: "وہ شخص جو اپنی زندگی اور ابنائے نوع کی زندگی کو بالکل بے مقصد سمجھتا ہے وہ نہ صرف بدنصیب اور نامراد ہے بلکہ اسے زندگی گزارنے کا قطعاً کوئی حق حاصل نہیں۔" آئن سٹائن کے اس بیان پر میں صرف اسی قدر اضافہ کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ ایسے شخص کو زندگی بسر کرنے کا صرف اس لیے موقع دینا چاہیے کہ ممکن ہے وہ الحاد کے بعد ایمان کی طرف لوٹ آئے۔"

اب میں اپنے ایک سائنس دان بھائی کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جس کی ذہانت اور فطانت کا میں اور میری طرح کے بہت سے دوسرے لوگ دل و جان سے معترف ہیں۔ میں نے ایک مرتبہ اُس سے یہ سوال کیا "خداوند تعالیٰ کے بارے میں مندرجہ بالا سطور میں میں نے جو کچھ عرض کیا ہے کیا وہ صحیح اور درست ہے؟ اُس نے اثبات میں جواب دیا لیکن اُس کے بعد وہ مجھ سے خدا کی صفات کے متعلق مختلف قسم کے سوالات پوچھنے لگا۔

میرے نزدیک اُس کی یہ فکری روش بالکل صحیح اور درست ہے۔ جو شخص بھی ان مسائل کے متعلق سوچنا شروع کرتا ہے اُس کے ذہن میں سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا خدا فی الواقع ہے، اس کے بعد وہ اس کی صفات کے بارے میں صحیح صحیح معلومات حاصل کرنے کا آرزومند ہوتا ہے، پھر وہ حیاتِ انسانی کے مقصد و مدعا کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور آخر میں وہ خیر و شر کے عقدہ کو حل کرنے کے لیے بیتاب دکھائی دیتا ہے۔

صفاتِ الٰہی | قدیم فلاسفہ اور حکماء نے صفاتِ باری تعالیٰ پر منطقی طرزِ استدلال کے ساتھ بڑی تفصیل سے بحث کی ہے۔ ان صفات کا جو کافی حد تک نامکمل ہیں۔ ہم ذیل میں تذکرہ کرتے ہیں۔

خدا ایک حی و قیوم ہستی ہے جسے کبھی فنا نہیں جو نہ تو مادہ ہے، نہ کوئی جسم رکھتی ہے اُسے بخت و اتفاق سے بھی تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ وہ مکمل و اکمل ذات ہے۔ ساری نیکیوں کا واحد سرچشمہ اور مبرا عن الخطا۔ اس سے کسی برائی کا صدور ممکن ہی نہیں۔ وہ کسی سے نفرت نہیں کرتا۔ وہ اپنی ذات میں لامحدود ہے۔ وہ ایک خالص سچائی ہے۔ اُس کا علم ہر چیز پر حاوی ہے۔ خدا محبت اور مشیت کا مظہر ہے۔ اُسے نہ تو بھوک لگتی ہے اور نہ ہی پیاس محسوس ہوتی ہے۔ سارے اخلاقی ضابطوں اور نیک اعمال کا وہ منبع اور مبداء ہے۔

اخلاقی علت | خدا پر ایمان لانے کے کئی وجوہ ہیں۔ ان میں اخلاقی علت اور ارادہ و اختیار کو کبھی بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس چیز سے میری مراد یہ ہے کہ انسان فکر و عمل کے معاملے میں خود مختار ہے۔

حیاتِ انسانی کا روحانی اور اخلاقی پہلو — یعنی اُسے کیا کرنا چاہیے، انسانی فلاح و بہبود کے نقطۂ نظر سے تسخیرِ کائنات سے بھی کہیں زیادہ اہم اور ضروری ہے۔ علوم طبیعی کا مطالعہ ہمیں اس کائنات کے بہت سے اسرار و رموز سے آشنا کرتا ہے اور ہمیں وہ ذرائع بہم پہنچاتا ہے جن سے کام لے کر ہم مال و دولت میں اضافہ کر سکتے ہیں اور اس کی بہتر اور منصفانہ تقسیم کے لیے نئی نئی تدابیر اور راہیں نکالنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ پھر انہی قوانین کی مدد سے ہم

ایسے وسائل بھی مہیا کرتے ہیں جن سے انسانی مصائب اور شدائد میں کمی واقع ہوتی ہے اور لوگوں کی عمریں دراز ہوتی ہیں۔ دورِ جدید کا سب سے اہم مسئلہ اخلاقی اور روحانی ہے۔ ہمیں اس وقت سب سے زیادہ جس چیز کی فکر لاحق ہے وہ یہ ہے کہ کسی طرح سائنسی قوت کو بنی نوع انسان کی تباہی اور بربادی پر صرف کرنے کی بجائے اُسے انسانی فلاح و بہبود پر صرف کیا جائے۔ تاریخ کے اوراق اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ ماضی میں انسانیت کو جب کبھی بھی اہم مسائل سے سابقہ پیش آیا تو اُن کی نوعیت سراسر اخلاقی تھی۔

عالم طبیعیات ناقابلِ تغیر اصولوں کا پابند ہے۔ یہی حال حیوانوں کا ہے۔ وہ بھی فطرت کے لگے بندھے ضابطوں کے تحت زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ خالقِ کائنات نے نوعِ بشری کو اس سے بہت ارفع و اعلیٰ بنایا ہے کہ وہ بے حس تقیدات کی غلام ہو اور اسے فکر و عمل کی کوئی آزادی نہ دی جائے۔ انسانی معاشرہ اُن افراد پر مشتمل ہے جو ارادہ و اختیار رکھتے ہیں اگر چاہیں تو شجرِ علم سے بہرہ مند ہوں اور چاہیں تو اجتناب کریں۔ اگر ہم قادرِ مطلق کے اخلاقی قوانین کی پابندی نہیں کرتے تو ہمیں اس کے نتائج خود بھگتنے پڑیں گے۔ اگر عالمِ طبیعیات کو بھی ارادہ و اختیار کی نعمت سے نوازا جاتا تو پھر انسانی آزادی بے معنی ہوتی ــــ اور یہ ساری کائنات آناً فاناً زیر و زبر ہو کر رہ جاتی۔

جانوروں کی حرکات و سکنات کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسانی سطح سے نیچے جتنی جاندار مخلوق ہے وہ قدرت کے مندرجۂ ذیل دو اصولوں کی پابند ہے:

۱۔ بقائے نفس

۲۔ بقائے نوع

اگر یہ دو اصول کارفرما نہ ہوتے تو کوئی نوع زندہ نہ رہ سکتی۔ جانوروں کی ساری حرکات جبلتوں کے محور پر گھومتی ہیں لیکن جوں جوں ہم حیوانی سطح سے بلند ہوتے چلے جاتے ہیں اسی قدر ہمارے افعال و اعمال پر شعور و آگہی کا تسلط ہونا شروع ہوتا ہے۔ ابھی تک اس امر کا فیصلہ نہیں کیا جا سکا کہ کیا حیوانوں کو بھی ارادہ و اختیار کی دولت میں کوئی حصہ ملا ہے؟ اگر کچھ ملا بھی ہے تو وہ بہت کم ہے

اس بنا پر اگر کوئی جانور اپنے جسم کی حفاظت اور پاسبانی کرتا ہے تو اُس کی غرض و غایت بجز اس کے اور کوئی نہیں ہوتی کہ وہ اپنے آپ کو اور اپنی نوع کو زندہ رکھ سکے۔ وہ جنگل کے قانون کے تحت زندگی بسر کرتے ہیں، وہ ایسے بے لچک اصولوں کے پابند ہوتے ہیں جن میں کسی تبدیلی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

تاریخ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ انسان آغاز ہی سے فطرت کے ان ضابطوں کے علاوہ بعض دوسرے اصولوں کا بھی پابند چلا آرہا ہے۔ وہ جب کسی عجیب و غریب شے کو دیکھتا ہے تو حیرت زدہ ہو جاتا ہے، اُس سے جب کوئی گناہ سرزد ہو جاتا ہے تو اُس کے اندر۔ احساسِ ندامت انگڑائی لیتا ہے اور وہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ جو قوت اُسے حیران اور پریشان کر رہی ہے وہ اُن افعال و اعمال کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتی جو گناہ کے دائرہ میں آتے ہیں۔

درندوں اور چوپاؤں سے لیکر اگر انسان جیسی اشرف المخلوقات، نوع کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ارتقاء کی ان مختلف منازل کے درمیان خطِ امتیاز صرف ارادہ اور اختیار ہے اور اسی کے ذریعہ انسان اپنے ماحول کی تسخیر اور اپنے آپ کی تسخیر کا سبق حاصل کرتا ہے۔ انسان کو فیصلے کی جو آزادی حاصل ہے اسی کی آغوش میں خیر و شر کے احساسات پرورش پاتے ہیں۔

علت کی اس لمبی زنجیر کا نقطۂ آغاز کیا ہے؟ کیا یہ زنجیر یونہی بخت و اتفاق سے شروع ہو گئی۔ جس طرح انسان کا ذہن اس بات کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا کہ اچانک فرش پر پانی گرنے سے دنیا کا نقشہ مرتب ہو جائے اسی طرح عقل یہ چیز بھی باور کرنے پر آمادہ نہیں ہوتی کہ علت کی یہ زنجیر یونہی بن گئی مجھے یہ تسلیم کرنے میں قطعاً کوئی تامل نہیں کہ قانونِ علت جو عالمِ طبعیات میں کارفرما ہے، جس کے تحت نباتات، اور حیوانات زندگی بسر کرتے ہیں، اور جس کے ذریعہ انسانی ذہن نے نشوونما پائی ہے، وہ ہمیں اخلاقی اور روحانی اقدار کے معاملے میں بھی رہنمائی دیتا ہے۔ مثال کے طور پر محبت، عدل و انصاف، رحم، خالق کے مخلوق پر حقوق یہ وہ اعلیٰ اقدار ہیں جنھیں نہ تو گنا جا سکتا ہے اور نہ ہی انہیں ماپا اور تولا جا سکتا ہے۔ میں یہ بات پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا

ہوں کہ انسانیت کے مستقبل کا سارا دارومدار اسی فیصلہ پر ہے کہ کیا وہ ان ابدی اقدارِ حیات کو اپنانے پر تیار ہوگی یا نہیں۔ بنیادی ضروریات حاصل ہو جانے کے بعد انسان اگر صحیح معنوں میں سکون اور طمانیت کا متمنی ہے تو اسے لازمی طور پر انہیں روحانی اور اخلاقی چیزوں کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔

تاریخی شواہد کا جائزہ لینے اور مسلسل غور و فکر کے بعد میرا دل اس بات پر مطمئن ہو گیا ہے کہ ایک انسانی اخلاقی اقدار کو صرف اسی صورت میں اپنانے کے لیے تیار ہوتا ہے جب اسے اس بات کا یقین کامل ہو کہ ایک قادرِ مطلق ہستی جو ہر لحاظ سے کامل و اکمل ہے وہ انسان کے فکر و عمل کی رہنمائی کرتی ہے۔ اس کائنات میں نظم و ترتیب کی موجودگی اور قانونِ علت کی فرمانروائی کے محض اعتراف سے مذہب کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ مذہب کی حد تو اس احساس سے شروع ہوتی ہے کہ انسان کو اپنی روزمرہ زندگی میں خدا کے پیش کردہ ضابطۂ حیات کا پورا پورا احترام کرنا چاہیے۔ گزشتہ سالوں کے روح فرسا واقعات نے اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ اخلاق، حق و انصاف اور آزادی کی بنیاد اگر خدا ترسی پر قائم نہ ہو تو اس سے نہایت ہی خطرناک نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ نوعِ بشری کے لیے سکون اور اطمینان کی زندگی صرف خدا پرستانہ ماحول ہی میں ممکن ہے۔ انسانیت کے اندر مساوات کی روح اخلاقی قوانین ہی سے بیدار ہوتی ہے۔ اگر خدا کا تصور نظروں سے اوجھل ہو جائے یا اخلاق کے حتمی ضابطے ختم کر دیئے جائیں تو پھر غلامی کے خلاف ظلم و تعدی اور انسان کی حرص و ہوا کے خلاف کوئی دلیل بھی درست نہیں مانی جا سکتی۔ جب یہ تسلیم کر لیا جائے کہ انسان کوئی پائیدار اخلاقی اقدار نہیں رکھتا، اُسے فکر و عمل کی کوئی آزادی نہیں، اُسے کوئی مستقل حقوق بھی حاصل نہیں تو اس سے انسان خود بخود اس نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے کہ انسانیت خارجی حالات کے ہاتھ میں بے بس کھلونا ہے اور اس کے وہ افراد جنہیں قدرت کی طرف سے ذہانت اور فطانت کا وافر حصہ ملا ہے وہ اگر کمزور اور بے بس لوگوں کو اپنے ظلم کا تختۂ مشق بناتے ہیں تو وہ بالکل حق بجانب ہیں۔ انسان اگر کسی مستقل حیثیت کا دعویدار ہے

اسے اگر کوئی دائمی شرف اور وقار حاصل ہے تو وہ محض اس بنا پر ہے کہ وہ خدا کی مخلوق ہے خدا پر ایمان لائے بغیر انسانی شرف کا تصور بالکل بے معنی سی چیز معلوم ہوتی ہے۔

امریکہ آج جن حالات سے گذر رہا ہے وہ انتہائی افسوسناک ہیں۔ ہمیں ہر لمحہ اس بات کا شدید احساس ہو رہا ہے کہ یہاں کے باشندوں میں جمہوری روح دن بدن کمزور پڑتی جا رہی ہے۔ اس کی وجہ میرے نزدیک صرف ایک ہی ہے کہ نئی دنیا کا یہ سرسبز و شاداب خطہ غیر محسوس طور پر الحاد کے نرغے میں گھر رہا ہے اور اسی بنا پر اس کی مذہبی اور روحانی بنیادوں میں ایک زلزل سا پیدا ہو گیا ہے۔ دنیائے مغرب اس بات کے لیے انتہائی کوشاں ہے کہ کسی طرح انسانی حقوق کو اُن روحانی سرچشموں سے منقطع کر دیا جائے جو الہامی مذہب کے منبع سے نکلتے ہیں اور پھر انہیں مستقل اور پائیدار بھی بنایا جا سکے۔ لیکن یہ چیز ناممکنات میں سے ہے۔ روحانیت کی جڑوں کو کھوکھلا کر دینے کے بعد اخلاق کی سر بفلک عمارت کو اپنی جگہ پر قائم رکھنا ایک ایسا خواب ہے جو کبھی بھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ انسانیت نے بارہا اس حماقت کو آزمایا اور ہمیشہ منہ کی کھائی۔